سانس

جب ہم کچھ بھی نہیں کر رہے ہوتے تب بھی ہم ایک اہم ترین کام کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ کام ہے سانس لینا۔ ہم آرام کی حالت میں عام طور پر ایک منٹ میں ایک سے ڈیڑھ درجن دفعہ سانس لیتے ہیں۔ سانس لینا اتنا غیر محسوس عمل ہے کہ سوائے اس کے کہ ہم کسی دوڑ میں حصہ لیں ہمیں کبھی یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم سانس لے رہے ہوتے ہیں۔

سانس لینے کا عمل ہماری زندگی کی سب سے بنیادی ضرورت ہے۔ ہم کھانا کھائے بغیر کئی دن جی سکتے ہیں۔ بغیر پانی کے بھی ایک دو دن گزار سکتے ہیں۔ مگر بغیر سانس کے ایک منٹ بھی جی نہیں سکتے۔

سانس لینے کے عمل میں ہم اپنے جسم سے کاربن ڈائی آکسائڈ خارج کرتے ہیں اور آکسیجن کو جذب کرتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی پیچیدہ عمل ہے جو جسم کے سب سے بڑے اندرونی اعضا یعنی پھیپھڑوں اور ایک انتہائی پیچیدہ اور نازک نظام تنفس کی مدد سے سرانجام پاتا ہے۔ یہ آکسیجن ہمارے خلیوں کو دوبارہ پاک صاف کر کے ہماری زندگی کو قائم و دائم رکھتی ہے اور پیدائش سے موت تک ایک لمحے کے وقفے کے بغیر ہمیشہ یہ عمل جاری رہتا ہے۔ اس عمل میں ہم روزانہ گیارہ ہزار لیٹر آکسیجن فضا سے اپنے جسم میں منتقل کرتے ہیں۔

ایک ایسے دور میں جب ہم مہنگائی کا رونا روتے ہیں، اللہ تعالیٰ اتنی ساری آکسیجن ہمیں روزانہ مفت دیتے ہیں۔ پھر اس کو استعمال کرنے والا پورا نظام بھی بلا معاوضہ ہمیں ملا ہوا ہے۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ ورنہ اس جیسی ان گنت نعمتیں ہمیں ساری زندگی مفت ملی رہتی ہیں۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ جب بھی شیطان ناشکری اور محرومی کی نفسیات ہم میں پیدا کرے ہم ان تمام نعمتوں کو یاد رکھیں اور ہر سانس کے ساتھ اپنے رب کا شکرادا کرتے رہیں۔

اللہ اکبر

عیدالاضحیٰ کے ایام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنت قائم کی ہے کہ نویں کی فجر سے تیرہویں کی عصر تک ہر نماز کے بعد تکبیرات پڑھی جاتی ہیں۔ تکبیر کا مطلب اللہ کی کبریائی کا بیان ہے۔ اسے عام طور پر اللہ اکبر کے الفاظ سے بیان کیا جاتا ہے۔

اللہ اکبر کے الفاظ وہ سب سے بڑی حقیقت ہیں جو کسی انسان کی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں۔ یہ اتنے بڑے الفاظ ہیں کہ آسمان و زمین بھی ان کی عظمت کا تحمل نہیں کر سکتے، مگر شرط یہ ہے کہ یہ الفاظ اپنی اصل اسپرٹ کے ساتھ پڑھے جائیں۔ ان الفاظ کی اصل اسپرٹ یہ ہے کہ ایک بندہ عاجز یہ دریافت کر لے کہ یہ عظیم ترین کائنات، سورج، چاند، ستارے، شجر و حجر، چرند و پرند، ہوا پانی، دریا صحرا، خشکی و تری، بلندی و پستی، انسان و حیوان، مرد و عورت سب کا مالک ایک ہی ہے۔ اور وہی میرا بھی مالک ہے۔ میرا ہر خیر و شر، خوشی و غمی، نفع و ضرر اسی کے ہاتھ میں ہے۔ میں عاجز مطلق ہوں وہ قادر مطلق ہے۔ میں کچھ بھی نہیں وہ سب کچھ ہے۔

یہی احساس اللہ اکبر ہے۔ یعنی اللہ بڑا ہے اور میں چھوٹا ہوں۔ مگر جیسا کہ ایک عارف باللہ نے ٹھیک کہا ہے۔ آج اللہ اکبر کا مطلب یہ بن گیا ہے کہ اللہ بڑا ہے اور تم چھوٹے ہو۔ لوگوں نے اللہ کی عظمت کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ دوسروں کو چھوٹا سمجھا جائے۔ حالانکہ اللہ کی عظمت وہی شخص دریافت کرتا ہے جو اپنے چھوٹے ہونے کو جان لے۔ ایسا شخص دوسروں کی خامیاں دریافت کرنے اور ان کے عیوب ڈھونڈنے کے بجائے اپنی اصلاح کی طرف زیادہ متوجہ رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ اکبر سے بڑا کوئی کلمہ نہیں جو انسانی زبان ادا کر سکے۔ مگر یہ کلمہ رب کی عظمت کو دریافت کرنے اور اس کے سامنے اپنے عجز کو جاننے کا نام ہے۔ یہ زبان سے محض اللہ اکبر کے الفاظ ادا کر کے دوسروں کے عیوب ڈھونڈنے اور ان پر اسلام ٹھونسنے کا نام نہیں۔

عیدالاضحیٰ اور حج

حج اہم ترین عبادت ہے۔ یہ اللہ کے دشمن شیطان کے خلاف اعلان جنگ کا نام ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ خیر و شر کی کشمکش میں ہم غیر جانبدار نہیں بلکہ خیر کے ساتھ ہیں۔ ہم شر کو ہر قدم پر سنگسار کرتے رہیں گے اور اس راہ میں اپنی انا، تعصّبات، خواہشات، اپنے مال اور یہاں تک کہ اپنی جان کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔

تاہم حج اتنی مشکل اور کٹھن عبادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے زندگی میں ایک ہی دفعہ فرض کیا ہے۔ پھر بھی بہت سے لوگ اس کے اسباب نہیں جمع کر پاتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام فرمایا ہے کہ خوشیوں بھرے عیدالاضحیٰ کے تہوار کو حج کی اس عظیم عبادت سے متعلق کر دیا۔ پھر اس تہوار میں حج کی نمائندہ ترین عبادات شامل کر دیں۔ تہوار چونکہ ہر شخص مناتا ہے اس لیے عملی طور پر تہوار کے ذریعے سے پوری امت حج میں شریک ہوجاتی ہے۔

عیدالاضحیٰ پر تین عبادات خصوصی طور پر ادا کی جاتی ہیں۔ یہ تینوں حج کے تعلق سے اس موقع پر ادا کی جاتی ہیں۔ پہلی دو رکعت عیدالاضحیٰ اور اس کا خطبہ۔ یہ خطبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کی نشانی ہے جو اب ہر برس عرفات کی مسجد نمرہ میں امام حج دیتا ہے۔ پھر دو دو رکعت نماز ظہر و عصر ادا کی جاتی ہے۔ اس مناسبت سے دو رکعت عیدالاضحیٰ ادا کی جاتی ہے۔

قربانی حج کا منتہائے کمال ہے جو اس بات کا علامتی اظہار ہے کہ شیطان کے خلاف جنگ میں جان بھی دینی پڑے تو حاضر ہے۔ یہی قربانی عید میں شامل کر دی گئی۔ آخری چیز تکبیرات ہیں جو نویں کی فجر سے تیرہویں کی عصر تک ادا کی جاتی ہیں۔ یہ اس ذکر کی یاددہانی ہے جس کی تلقین قیام منیٰ میں حجاج کو کی گئی ہے۔ جس شخص کو حج اور عید کے اس تعلق کی سمجھ آ جائے وہ عید کے ایام میں ذہنی طور پر حج کی حالت ہی میں رہتا ہے اور اللہ کی خصوصی رحمت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

ایک دشمن اسلام: خدا کے حضور

پروردگار عالم! میں آپ کا بے حد و حساب شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے جیسے مجرم کو سزا سنانے سے پہلے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع دیا۔ پروردگار عالم! آج جب کہ میزان عدل نصب کی جا چکی ہے مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھ انصاف ہوگا۔

یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں نے اپنی زندگی میں سچائی کو نہ مانا۔ کسی سچائی کو سمجھنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ میں نے ساری زندگی اسلام کو پڑھا، قرآن کو سمجھا، پیغمبر اسلام کی سیرت کو دیکھا، مگر ہمیشہ ایک معاند اور دشمن کی نگاہ سے۔ آپ نے مجھے مذاہب کا عالم بنایا۔ مگر میں نے اس علم کو اسلام دشمنی میں استعمال کیا۔ آپ نے مجھے عقل و فہم اور ذہانت کی دولت سے نوازا مگر میں نے اس دولت کو اسلام دشمنی کے فروغ میں لٹادیا۔ آپ نے مجھے لکھنے اور بولنے کی صلاحیت دی، مگر یہ صلاحیت آپ کے بندوں کو آپ کے پیغام، آپ کے دین اور آپ کے پیغمبر سے دور کرنے میں صرف ہوئی۔ مجھے اپنے ہر جرم کا اعتراف ہے۔ مگر سزا کا فیصلہ سنائے جانے سے قبل ایک گزارش آپ کی بلند و اعلیٰ بارگاہ میں پیش کرنی ہے کہ آپ جیسا عدل کرنے والا پوری کائنات میں کوئی نہیں۔

پروردگار عالم! مجھے معلوم ہے کہ مجھے سچائی کی مخالفت کی بنا پر سزا ہوگی۔ اس بنا پر سزا ہوگی کہ میں نے اسلام کی دعوت کو پانے کے باوجود اس پر کبھی سنجیدگی اور ہمدردی سے غور نہیں کیا۔ بلکہ اپنے خودساختہ تصورات کے مطابق نہ پا کر اسلام کے خلاف بدترین پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ مگر دلوں کے حال جاننے والے رب! میں اس جرم میں تنہا تو نہیں ہوں۔

کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اسلام کے جو نام لیوا آپ کے سامنے اِس وقت موجود ہیں، وہ بھی اِسی جرم کے مرتکب ہیں؟ میں نے اگر اپنے پیدائشی مذہب کو آخری حق مانا ہے تو یہ لوگ بھی اپنے پیدائشی فرقے کو آخری حق مانتے ہیں۔ میرے ماحول اور اساتذہ نے جس دین کو میرے سامنے

واحد سچائی کے طور پر پیش کیا میں زندگی بھر اسی کے لیے لڑتا رہا۔ ان لوگوں کے ماحول اور اساتذہ نے بھی جس فرقے اور نظریات کو ان کے سامنے واحد سچائی کے طور پر پیش کیا یہ بھی زندگی بھر اس کے لیے لڑتے رہے۔ میں بھی اڑیل ٹٹو بنا رہا۔ یہ بھی اپنے ''سچ'' پر اڑے رہے۔ میں اپنے تعصّبات کو سچ سمجھتا رہا۔ یہ بھی اپنے تعصّبات کو حق سمجھتے رہے۔

پروردگار عالم! میں نے اپنے دین کے علاوہ ہر دوسرے دین کے خلاف عناد پال لیا۔ یہ بھی اپنے فرقے کے علاوہ ہر ایک کے خلاف عناد میں مبتلا رہے۔ میں مخالفت برائے مخالفت کے اصول پر جیا۔ یہ بھی اسی اصول پر جیے۔ میں نے مخالفت میں ہر اخلاقی حد کو پار کیا۔ انھوں نے بھی پار کیا۔ میں نے حسن ظن رکھنے کے بجائے بدگمانی کی۔ یہی انھوں نے کیا۔ میں شہد کی مکھی کی طرح پھولوں کا رخ کرنے کے بجائے گندگی کی مکھی بن کر ہمیشہ کمزور بات کی طرف لپکا۔ یہی ان کا بھی رویہ تھا۔ میں نے بات کو سیاق وسباق سے کاٹا۔ انھوں نے بھی دوسروں کو اسی طریقے پر بدنام کیا۔ میں نے سچائی کے جواب میں نکتہ آفرینی کی۔ انھوں نے بھی سچائی کو ایسے ہی رد کیا۔ میں نے لوگوں کو بہکانے کے الزام، بہتان اور جھوٹ کا سہارا لیا۔ انھوں نے بھی یہی کیا۔ میں نے سچائی کو چھپایا۔ انھوں نے بھی چھپایا۔ میں نے اصل بات سے پہلوتہی کی۔ انھوں نے بھی کی۔ میں حق بات بیان کرنے کے وقت خاموش رہا۔ یہ بھی خاموش رہے۔

اب اگر آپ میرے لیے جہنم کا فیصلہ سناتے ہیں تو سر آنکھوں پر کہ آپ عادل ہیں۔ مگر میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ کس اصول پر جنت میں جائیں گے؟ جب رویہ ایک ہے تو بدلہ بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ ان کا بدلہ اگر جنت ہے تو میں جہنم میں کیسے جا سکتا ہوں؟ اگر میں جہنم کا مستحق ہوں تو میں آپ کے عدل سے یہ کیسے توقع کروں کہ یہ جنت میں بھیجے جائیں گے۔ میرے ساتھ عدل کیجیے۔ یا تو ان کو جہنم میں میرے ساتھ کیجیے یا مجھے ان کے ساتھ جنت میں بھیجیں۔ آپ کی عزت اور جلال کی قسم آپ سے بڑھ کر عدل کرنے والا کوئی نہیں۔

عالی جاہ! مجھے اس کے سوا آپ کی بارگاہ میں اور کچھ نہیں کہنا۔

بیس برس کی بات

میرے ایک محترم اور عزیز دوست پچھلے دنوں ایک مغربی ملک گئے۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد میری ان سے بات ہوئی تو ان کو بہت رنجیدہ پایا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اپنے ایک ماہ کے قیام کے دوران میں انھوں نے وہاں ہر سمت مادی ترقی کے ساتھ انسان دوستی اور حکومت کی طرف سے سہولیات کی فراہمی کے ساتھ شہریوں کی طرف سے سماجی ذمہ داری کا ایک ایسا امتزاج دیکھا جس نے ان کو ہلا کر رکھ دیا۔ قدم قدم پر وہ وہاں کے معاملات کا پاکستان سے موازنہ کرتے رہے اور کڑھتے رہے۔

یہ غم تنہا ان کا ہی نہیں بلکہ کم وبیش ہر اس حساس اور دردمند پاکستانی کا ہوتا ہے جسے ملک سے باہر کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہوتا ہے۔ اس طرح کے مشاہدات کے بعد لوگوں کے دو ہی نمایاں ردعمل ہوتے ہیں۔ چند خاص ردعمل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ملک چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ملک میں چار سو پھیلی ہوئی خرابیوں کا اتنا اثر لیتے ہیں کہ بہتری کی ہر امید سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا سارا زور بس اسی پر ہوتا ہے کہ اس ملک میں رہتے ہوئے ہی اپنی اور اپنے خاندان کی مادی ترقی کو نصب العین بنا لیں اور معاشرتی خیر وشر سے بے نیاز ہو جائیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک پاکستان کے حالات کئی پہلوؤں سے بہت زیادہ خراب ہیں۔ جس ملک میں حکمران کلاس کی ایک بڑی تعداد کرپشن کے سمندر میں غوطہ زنی کر کے فارن اکاؤنٹس کو بڑھاتے چلے جانے کے فن کی ماہر ہو۔ جس ملک کی کئی سیاسی جماعتوں میں مسلح ونگز پائے جاتے ہوں جن کا کام اپنے ہی شہریوں کو قتل کرنا اور لوٹ مار کرنا ہو۔ جس ملک کے مذہبی طبقات کا ایک حصہ دہشت گردوں کی حمایت اور تحفظ کو اپنا فرض سمجھتا ہو۔ جس ملک کی اشرافیہ لوٹ مار، ناجائز منافع خوری، ملاوٹ جیسے جرائم کو کاروبار سمجھتی ہو۔ جس ملک کے عوام ٹریفک قوانین توڑنے، ہر جگہ پان اور

تھوک کی پچکاری مارنے کے عادی ہوں وہاں کسی اصلاح کی امید رکھنا بہت بڑے حوصلے کی بات ہے۔

تاہم اس حوالے سے دو باتیں اگر ذہن میں رہیں تو انسان کبھی مایوس نہیں ہوسکتا۔ پہلی بات یہ ہے کہ پاکستان جیسے ملک میں رہ کر جو شخص ایمان واخلاق کے تقاضوں کو نبھاتا گیا اور حوصلے کے ساتھ اپنی اور دوسروں کی اصلاح کی جدوجہد کرتا رہا، اس میں کسی معمولی شک کی گنجائش نہیں کہ وہ بہت معمولی قربانی دے کر قیامت کے دن انبیا اور شہدا کی قربت کا اعزاز حاصل کر لے گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کے عمل سے زیادہ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ عمل اس نے کس قسم کے حالات اور پس منظر میں کیا ہے۔ چنانچہ انتہائی مایوس کن حالات میں ڈٹے رہنے والے لوگوں کا اجر وہی ہوگا جو قرآن مجید میں ان لوگوں کا بیان ہوا ہے جو فتح مکہ سے پہلے ایمان لا کر اس کے تقاضوں کو نبھاتے رہے۔

یاد رکھنے کی دوسری بات یہ ہے کہ مغربی ممالک بھی آج جس مقام پر ہیں یہ ایک دن کی بات نہیں۔ چند صدی پہلے قرون وسطیٰ کے عہد میں یورپ بھی انہیں تاریکیوں اور مایوسیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں انھوں نے مسلمانوں کے عروج اور ترقی کو دیکھا تو ان کی آنکھیں ویسے ہی کھل گئیں جیسے آج مغربی ممالک جانے والے مسلمانوں کی کھلتی ہیں۔ جس کے بعد ان کے باشعور طبقات نے اپنے ہاں ایک مسلسل جدوجہد شروع کر دی۔ یہ جدوجہد کئی صدیوں تک جاری رہی۔ آخر کار بیسویں صدی میں جا کر وہ وقت آیا جب انھوں اپنے ہاں ایک بہترین سماج قائم کر لیا۔ چنانچہ آج اگر ہمارے ہاں بھی ایسے ہی بلند حوصلہ اور صاحب نظر لوگ پیدا ہو جائیں تو یہ صدیوں کی نہیں بمشکل دو عشروں کی بات ہے کہ ہمارے ملک کے حالات بھی بدل جائیں گے۔ مگر شرط یہ ہے کہ لوگ مایوسی کو چھوڑیں اور اپنی ذات سے بلند ہو کر اجتماعی بہبود کے لیے کام شروع کر دیں۔

عمران خان ایک اور عظیم موقع

جیوڈیشل کمیشن کا فیصلہ آ گیا۔ یوں 2013 کے انتخابات کے بعد دھاندلی کے الزامات سے پیدا ہونے والے تنازع کا خاتمہ ہو گیا۔ خود عمران خان صاحب نے بھی جیوڈیشل کمیشن کا فیصلہ تسلیم کر لیا۔ یہ بلاشبہ عمران خان صاحب کی ایک اچھی روایت ہے جس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔

اس وقت بہت سے تجزیہ نگار عمران خان کو زبردست تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ اس بات پر کہ انھوں نے دو برسوں تک اور خاص کر دھرنوں کے دوران میں پوری قوم کو منتشر کیے رکھا۔ اس بات پر کہ انھوں نے اپنے سیاسی مخالفین ہی نہیں بلکہ بعض اہم عدالتی اور صحافتی شخصیات پر سنگین ترین الزامات لگائے اور ان کو ثابت نہیں کر سکے۔ اس بات پر کہ اس غیر ضروری تنازع کی وجہ سے ملک کو معاشی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں سے بہت نقصان پہنچا۔ جبکہ عمران خان کے حامی ان کے طرز عمل کی مختلف توجیہات بیان کر رہے ہیں۔

تاہم اس سے قطع نظر، ہر وہ باشعور شخص جو لیڈروں کی پیروی میں اندھا نہیں ہو جاتا، اسے ان نقصانات کا ادراک ہے جو اس تنازع کی وجہ سے ہمارے ملک کو پہنچے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ عمران خان جو ملک میں تبدیلی کی ایک امید بن کر ابھرے تھے، اس غیر ضروری تنازع نے ان کی مقبولیت کو بہت دھچکہ پہنچایا ہے۔ بلاشبہ یہ بات پورے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ عمران خان کی جتنی کچھ مقبولیت باقی ہے، اس کا سہرا ان کی اپنی خوبیوں کے بجائے ان کے مخالف سیاستدانوں کی نااہلی اور کرپشن کے سر جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سن 2013 میں عمران خان کو ایک زبردست موقع دیا تھا۔ ان کے پاس یہ مکمل موقع تھا کہ وہ کے پی کے کو ایک ماڈل صوبہ بنائیں۔ ترقی، شفافیت اور عوامی فلاح و بہبود کا ایک ایسا نمونہ قائم کریں کہ دوسرے سیاستدانوں کے پاس مقابلے کا اس کے سوا

کوئی راستہ نہ بچے کہ وہ بھی ان کے نقش قدم کی پیروی کریں یا ہمیشہ کے لیے مٹ جائیں۔

دھرنوں کے دوران میں ان کے پاس یہ بھرپور موقع تھا کہ وہ وزیراعظم کے استعفیٰ کا مطالبہ کرنے کے بجائے اگلے الیکشن میں دھاندلی سے پاک انتخابات اور سیاستدانوں کی کرپشن کے احتساب کے شفاف نظام کو یقینی بنائیں۔ حکومت جتنے دباؤ میں تھی یقیناً یہ چیزیں مان لیتی۔ بدقسمتی سے اس کے بجائے ان کا زور اس بات پر رہا کہ سن 2013 کے الیکشن میں دھاندلی ثابت کر کے وہ خود وزیراعظم بن جائیں۔

ان سارے حقائق کے باوجود عدالتی کمیشن کے فیصلہ کے بعد عمران خان کے پاس ایک اور عظیم موقع باقی ہے۔ وہ یہ کہ 2018 کے انتخابات سے قبل وہ ہنگامی بنیادوں پر کے پی کے کی ترقی کو جہاں ان کو اقتدار حاصل ہے، اپنا سب سے بڑا ہدف بنالیں۔ وہاں ایک بہترین انتظامی ڈھانچہ قائم ہو اور ہر قسم کی کرپشن ختم کر کے عوامی بہبود کے منصوبوں پر جنگی بنیادوں پر کام کیا جائے۔ اٹھارہویں ترمیم کے بعد صوبوں کو ملنے والے وافر فنڈز اور کے پی کے میں دہشت گردی کے خاتمے کے بعد یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں۔ خاص طور پر عمران خان کے لیے جن کی شہرت ہی یہی ہے کہ وہ مشکل ترین ہدف اپنی محنت سے حاصل کر لیتے ہیں۔

اس قوم کی اور خود اپنی دوسری خدمت وہ یہ کر سکتے ہیں کہ 2018 سے قبل دھاندلی سے پاک انتخابات کے نظام کو یقینی بنائیں۔ پوری قوم نے حال ہی میں دیکھا ہے کہ موبائل سموں کی تصدیق کے لیے کس طرح صارفین کے انگوٹھے کو اسکین کرنے کا سسٹم استعمال کیا گیا ہے۔ یہی کام شفاف انتخابات کے لیے کیا جا سکتا ہے۔ چاہے اس کے لیے ملک میں انتخابات ایک دن کے بجائے چھ یا سات مرحلوں میں کرانے پڑیں۔

عمران خان یہ دو کام کر دیں۔ تاریخ میں ان کا ذکر پاکستان کے عظیم ترین لیڈروں کی صف میں ہو جائے گا۔ ورنہ تاریخ کے کوڑے دان میں بہت لوگ پڑے ہیں۔

جاوید چوہدری

آرٹ آف لیونگ

''ہمارے دادا ہمیں سیب کے باغ میں لے جاتے تھے، ہمارے گروپ میں ان کے پوتے، پوتیاں، نواسے اور نواسیاں ہوتی تھیں'' یہ مختصر حکایت کا آغاز تھا، یہ حکایت امریکا کے کینسر اسپیشلسٹ نے لکھی، ڈاکٹر خورشید احمد گرو بفلو کے کینسر انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ہیں، یہ کشمیری نژاد امریکی شہری ہیں، یہ کامیاب کینسر سرجنز میں شمار ہوتے ہیں، دنیا کے نامور ماہنامے ''ریڈرز ڈائجسٹ'' نے گزشتہ ماہ 22 کامیاب لوگوں کے ایسے واقعات شایع کیے جنھوں نے ان کی زندگی میں انتہائی اہم کردار ادا کیا، یہ واقعات بنیادی طور پر وہ مشورے ہیں جو مختلف حضرات نے ان لوگوں کو مختلف ادوار میں دیے، ان لوگوں نے ان مشوروں کو پلے باندھ لیا اور یہ مشورے بعدازاں کامیاب لوگوں کی زندگی کے بند دروازے کھولتے چلے گئے، ریڈرز ڈائجسٹ نے یہ بائیس مشورے ایک جگہ جمع کیے اور اسے ''آرٹ آف لیونگ'' یعنی ''زندگی گزارنے کا فن'' کا نام دے دیا۔

یہ 22 مشورے واقعی شاندار ہیں لیکن مجھے ڈاکٹر خورشید گرو کے مشورے نے زیادہ متاثر کیا، ان کا کہنا تھا ''میں کشمیر میں پیدا ہوا، ہمارے دادا اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو اپنے سیب کے باغ میں لے جاتے تھے، باغ میں پرندے چونچوں سے سیب خراب کر جاتے تھے، سیب داغی ہو جاتے تھے اور یہ داغی سیب مارکیٹ میں نہیں بیچے جا سکتے تھے، ہمارے دادا یہ داغی سیب توڑتے، چاقو سے سیب کا خراب حصہ کاٹ کر پھینکتے اور صاف حصہ ہمیں کھانے کے لیے دے دیتے، ہمیں دادا کی یہ حرکت بری لگتی تھی، ہم نے ایک دن ڈرتے ڈرتے دادا سے پوچھا، دادا جی آپ ہمیں خراب سیب کیوں کھلاتے ہیں، دادا جی مسکرائے اور پیار سے بولے بیٹا، میں آپ لوگوں کو باغ کے سب سے اچھے سیب کھلاتا ہوں، میں نے پوچھا وہ کیسے، دادا جی نے جواب دیا،

بیٹا پرندے صرف پکے اور میٹھے سیبوں کو چونچ مارتے ہیں، میں ہمیشہ تم لوگوں کے لیے ایسے سیب تلاش کرتا ہوں جن کا ایک حصہ پرندے کھا چکے ہوتے ہیں کیونکہ یہ سیب پکا بھی ہوتا ہے اور میٹھا بھی۔'' ڈاکٹر خورشید کے بقول دادا کے جواب نے مجھے حیران کر دیا، میں نے اس واقعے سے ایک نتیجہ اخذ کیا، یہ نتیجہ میری زندگی کا بہترین ٹوٹکا اور نسخہ تھا، میں نے دادا جی کے جواب سے سیکھا ''کبھی رائے نہ بنائیں، ہمیشہ دوسروں سے پوچھیں'' (Never assume, Always ask.)۔ میں نے ہمیشہ پوچھا اور ہر بار فائدے میں رہا۔

ڈاکٹر خورشید احمد گرو کی بات میں وزن ہے، ہم میں سے زیادہ تر لوگ پوچھے اور سمجھے بغیر رائے قائم کر لیتے ہیں اور یہ لوگ اپنی رائے کو حتمی بھی سمجھتے ہیں اور یوں یہ پوری زندگی غلط اور حتمی رائے پر گزار دیتے ہیں، آپ فرض کیجیے، ڈاکٹر خورشید اپنے دادا سے خراب سیب کھلانے کی وجہ نہ پوچھتے تو کیا ہوتا؟ ڈاکٹر صاحب کی خاموشی کے تین نتائج نکلتے، ایک یہ پوری زندگی دادا کو کنجوس اور ظالم سمجھتے رہتے، دو، یہ زندگی کے اس شاندار ٹوٹکے سے محروم رہتے جس نے آنے والے دنوں میں ان کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور کر دیں اور تین، یہ پرندے اور سیب کے رشتے کو کبھی نہ سمجھ پاتے، یہ پوری زندگی اس ''فوک وزڈم'' سے محروم رہتے ''پرندے ہمیشہ میٹھے اور پکے پھل پر چونچ مارتے ہیں'' لہٰذا آپ اندازہ کیجیے ڈاکٹر خورشید کے ایک سوال نے ان پر دانائی کے کتنے راستے کھول دیے۔

ہمارا سب سے بڑا ''آرٹ آف لیونگ'' سوال ہے، کیوں؟ کیونکہ سوال دنیا میں دانائی کا سب سے بڑا سورس ہے، آپ کو سوال کرنے والے لوگ دنیا میں کبھی خالی ہاتھ نہیں ملیں گے، آپ اس سلسلے میں سقراط کی مثال لے لیجیے، سقراط کا پورا فلسفہ سوالوں پر مشتمل تھا، وہ پوچھنا شروع کر دیتا تھا اور الجھنوں کی گتھیاں سلجھتی چلی جاتی تھیں اور اس کے گرد علم کا انبار لگ جاتا تھا،

سقراط نے ثابت کیا سوال علم ہوتا ہے، یہ پوچھنے والوں کو عالم بنا دیتا ہے، سوال غلط فہمیاں ختم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ بھی ہوتا ہے، ہم زندگی میں سیکڑوں مرتبہ غلط فہمیاں پال لیتے ہیں، غلط فہمیاں تعلقات کا زنگ ہوتی ہیں، ہم انسان شروع میں غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں، ہم پھر اس غلط فہمی کو بنیاد بنا کر رائے قائم کرتے ہیں، یہ رائے آہستہ آہستہ پکی ہوتی جاتی ہے اور ہم بعد ازاں اپنی زندگی کی گاڑی اس رائے کی سڑک پر دوڑانا شروع کر دیتے ہیں، ہمیں جب اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو ہم اس وقت تک وہاں پہنچ چکے ہوتے ہیں جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی چنانچہ سوال غلط فہمیاں دور کرنے کا بہترین طریقہ بھی ہوتے ہیں، سوال آپ کی کمیونیکیشن میں بھی اضافہ کرتا ہے، آپ اگر بولنا سیکھنا چاہتے ہیں، آپ اگر اپنے اندر اعتماد پیدا کرنا چاہتے ہیں تو آپ سوال کا ڈھنگ سیکھ لیں، آپ کو بولنا آ جائے گا۔

میں نے آج تک سوال سے بہت کچھ سیکھا، میں شروع میں لوگوں کے دلائل، جواز اور حقائق کو چیلنج کر دیتا تھا، لوگ کہتے تھے ''یورپ مغرب میں ہے'' میں فوراً بول پڑتا تھا ''نہیں جناب یورپ جنوب مغرب میں ہے''۔ میں صرف یہ کہتا نہیں تھا بلکہ اس پر ڈٹ بھی جاتا تھا، لوگ میری اس حرکت سے تنگ آ جاتے تھے مگر میں اسے اپنا اعتماد سمجھتا تھا، میں نے وقت کے ساتھ ساتھ سیکھا، اعتماد اور بدتمیزی میں معمولی سا فرق ہوتا ہے اور ہم اکثر اوقات یہ فرق مٹا دیتے ہیں، میں جوانی میں بااعتماد نہیں تھا، میں بدتمیز تھا، میں حقائق ویری فائی کرنے کے بجائے چیلنج کر بیٹھتا تھا اور یوں اپنے اور دوسروں کے لیے مسائل پیدا کر لیتا تھا، میں اب دوسروں کے حقائق کو چیلنج نہیں کرتا، میں ''ویری فائی'' کرتا ہوں، پاکستان میں تھری جی، وائی فائی اور ٹچ اسکرین موبائل فونز نے ''ویری فیکیشن'' آسان کر دی ہے، آپ دوسروں سے بات سنیں، جیب سے موبائل نکالیں۔ ''سفاری'' پر جائیں، سوال ٹائپ کریں اور آپ چند سیکنڈ میں تمام معلومات ویری فائی کر لیں، آپ موبائل فون

پر کتابیں بھی کھول سکتے ہیں، آپ بڑی سے بڑی دستاویز میں چھپے حقائق بھی معلوم کر سکتے ہیں، یوں چند منٹوں میں معلومات اور حقائق کی تصدیق ہو جائے گی، یہ علم حاصل کرنے کا مجرب نسخہ ہے، میں روزانہ اس نسخہ کے ذریعے درجنوں چیزیں سیکھتا ہوں، میں نے وقت کے ساتھ ایک اور عادت بھی ڈویلپ کی، میں جب کسی سے ملتا ہوں تو میں اس سے یہ ضرور پوچھتا ہوں ''آپ کیا کرتے ہیں'' وہ شخص جس شعبے سے وابستہ ہوتا ہے، میں اس شعبے سے متعلق سوال کرنے لگتا ہوں، وہ بتاتا جاتا ہے اور میں سیکھتا ہوں، مجھے جہاں شک ہوتا ہے میں وہاں سفاری کھول کر بیٹھ جاتا ہوں، آپ بھی زندگی میں چیلنج کرنا بند کر دیں، ویری فیکیشن شروع کر دیں، آپ کی زندگی سکھی بھی ہو جائے گی اور آپ کے علم میں بھی اضافہ ہوگا۔

میں نے ایک نسخہ اپنے دوست ڈاکٹر صداقت سے بھی حاصل کیا، ڈاکٹر صاحب کامیاب بھی ہیں اور اچھے اور نفیس انسان ہیں، مجھے ایک بار ڈاکٹر صاحب کی کوئی بات اچھی نہ لگی، میں ان سے فاصلے پر چلا گیا، ڈاکٹر صاحب نے چند دن بعد فون کیا اور مجھ سے کہا ''مجھے لگتا ہے آپ کو فلاں بات اچھی نہیں لگی، آپ مجھ سے خفا ہیں، میرا قطعاً یہ مقصد نہیں تھا، میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا'' میں نے بھی اپنا دل کھول دیا، میں نے ان سے شکوہ کیا، ڈاکٹر صاحب نے وضاحت کی اور یوں بات ختم ہو گئی، آپ فرض کیجیے اگر ڈاکٹر صاحب مجھے فون نہ کرتے تو ہمارے درمیان موجود گرہ کتنی مضبوط اور بڑی ہو جاتی؟ یقیناً ہمارے تعلقات کمزور ہو کر ختم ہو جاتے، میں نے ڈاکٹر صاحب کے فون کو نسخہ بنا لیا، مجھے اب جوں ہی کسی کی طرف سے سرد مہری کا احساس ہوتا ہے تو میں فوراً اس سے رابطہ کرتا ہوں، یوں گلے شکوے ہوتے ہیں اور معاملہ ختم ہو جاتا ہے، میں اپنے دوستوں کو جب بھی غلط فہمیوں کی گرہوں میں پھنستا دیکھتا ہوں تو میں انہیں دوسروں سے رابطے کا مشورہ دیتا ہوں اور یہ رابطہ ہمیشہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

ہم میں سے اکثر لوگ یہ شکایت کرتے ہیں، لوگ میری بات سمجھ نہیں پاتے، میں لوگوں کو

سمجھانا چاہتا ہوں مگر سمجھا نہیں پاتا، میرا ابلاغ کمزور ہے، میری بات دل ہی میں رہ جاتی ہے اور میں وقت پر کسی کو بتا نہیں پاتا وغیرہ وغیرہ، میں بھی زندگی کے دو تہائی حصے میں اسی صورتحال کا شکار رہا، میں بھی لوگوں کو سمجھا نہیں پاتا تھا لیکن پھر ایک نسخہ ہاتھ آ گیا اور میں اس مسئلے سے بھی آزاد ہو گیا، مجھے پتہ چلا انسان جب تک خود نہ سمجھے، یہ دوسروں کو نہیں سمجھا پاتا، آپ جب تک سمجھ کر نہیں سمجھائیں گے، دوسرے آپ کی بات نہیں سمجھ پائیں گے، آپ کو اگر خود کسی چیز پر عبور نہیں تو آپ دوسروں کو خاک سمجھائیں گے؟

آپ فرض کیجیے، آپ کسی شخص کو آلو گوشت بنانے کا طریقہ سمجھانا چاہتے ہیں لیکن آپ خود آلو گوشت کے ایکسپرٹ نہیں ہیں تو آپ دوسرے شخص کو کیسے سمجھائیں گے؟۔ میں اب جب تک خود نہ سمجھ لوں میں دوسروں کو سمجھانے کی غلطی نہیں کرتا، ہم لوگ سمجھاتے وقت اکثر محفل میں موجود لوگوں کو فراموش کر بیٹھتے ہیں، ہمیں بولنے سے قبل ہمیشہ اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے، میں جن لوگوں کو یہ بات سمجھانا چاہتا ہوں کیا انہیں اس کی ضرورت ہے؟ اگر جواب ہاں میں آئے تو آپ ضرور سمجھائیے اور اگر جواب ناں ہو تو آپ خاموش ہو جائیں اور ان لوگوں سے وہ سمجھنے کی کوشش شروع کر دیں جس کے یہ لوگ ایکسپرٹ ہیں۔ مثلاً آپ پائلٹ ہیں اور آپ گدھا گاڑیاں چلانے والوں کو یہ سمجھانا شروع کر دیں کہ ''جہاز کیسے اڑایا جاتا ہے'' تو آپ یقیناً ناکام ہو جائیں گے، آپ اس کے مقابلے میں انہیں گدھے کو توانا اور گدھا گاڑی کو مضبوط بنانے کا طریقہ سمجھائیں گے تو یہ لوگ چند منٹ میں سمجھ جائیں گے چنانچہ سمجھانے سے قبل آپ کا سمجھنا بھی ضروری ہے اور آپ جن لوگوں کو سمجھانا چاہتے ہیں، ان لوگوں کا بیک گراؤنڈ سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

آپ اگر زندہ ہیں تو آپ کو روزانہ نئی باتیں سیکھنی چاہئیں، یہ نئی باتیں ''آرٹ آف لیونگ'' کہلاتی ہیں، یہ آرٹ آف لیونگ کشمیر جیسے دور دراز علاقوں کے نوجوانوں کو ڈاکٹر خورشید کی طرح کینسر سپیشلسٹ بناتا ہے، آپ بھی کھڑکی کھولیں، آپ بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

(بشکریہ روزنامہ ایکسپریس)

ابویحییٰ

عام لوگوں کی آزمائش

سوال:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سر میرا سوال قرآن کریم کی ایک آیت کے بارے میں ہے۔

أَحَسِبَ لنَّاسُ أَن يُتۡرَكُوٓاْ أَن يَقُولُوٓاْ ءَامَنَّا وَهُمۡ لَا يُفۡتَنُونَ (العنکبوت 29: 2)

''کیا لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیئے جائیں گے اور اُن کی آزمائش نہیں کی جائے گی۔''

سر کیا یہ آیت عوام الناس کے لیے ہے اور کیا اس میں آزمائش سے مراد سخت حالات ہیں؟ میری نجات کے لیے میرا سخت حالات میں مبتلا ہونا ضروری ہے کیا؟ عبداللہ

جواب:

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جی نہیں۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے کسی عمومی ضابطے کو بیان نہیں کر رہی۔ اس آیت کا تعلق عہد رسالت سے ہے۔ اس وقت چونکہ انسانوں کی تطہیر کی جاتی ہے اس لیے یہ لازمی ہوتا ہے کہ رسول کے نام لیواؤں کو سخت ترین حالات سے گزارا جاتا ہے تا کہ منافقین چھٹ کر الگ ہو جائیں۔ قرآن مجید میں کئی مقامات اور خاص کر سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران میں اس کو بہت تفصیل سے موضوع بنایا گیا ہے۔ سورہ بقرہ میں یہ بار بار بتایا گیا ہے کہ ہم تمھیں آزمائیں گے اور سورہ آل عمران میں جنگ احد کے بعد نازل ہونے والا خطبہ اسی کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو جو

شکست ہوئی اور جو بہت سے مسلمان شہید ہوئے وہ اسی لیے تھا کہ اسلام کی ابتدائی کامیابیوں کی وجہ سے منافقین بھی ساتھ آتے جا رہے تھے، مگر اس طرح کی سخت آزمائش کے بعد منافقین ساتھ آنے کی ہمت نہیں کرتے اور صرف مخلصین ہی ساتھ رہتے ہیں۔

رہے عام لوگ تو عام لوگوں پر بھی آزمائش آتی ہے۔ وہ بھی بعض اوقات سخت حالات سے گزارے جاتے ہیں، مگر اس کا تعلق عام انسانوں سے متعلق آزمائش کے عمومی قانون سے ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ لوگوں کو اچھے برے حالات سے آزماتے ہیں۔ اس میں کسی انسان پر آزمائش کا آنا لازمی نہیں بلکہ بعض اوقات عام لوگوں پر ساری زندگی کوئی مشکل نہیں آتی یا بہت کم مشکلات آتی ہیں۔ ہمیں اپنے لیے اللہ سے آسانی ہی مانگنی چاہیے۔

ابویحییٰ

یوگا اور مراقبہ

سوال:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کیا اسلام کے مطابق مراقبہ اور یوگا جائز ہے یا نہیں؟ شفقت علی

جواب:

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک اصولی بات سمجھ لیجیے۔ مسلمانوں کے لیے دوسرے مذاہب کے مذہبی شعائر اختیار کرنا درست نہیں ہیں۔ باقی جو چیزیں مذہبی نوعیت کی نہیں ہیں ان کو اختیار کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یوگا جہاں تک ہم جانتے ہیں ایک نوعیت کی ایکسرسائز ہے۔ اس کا براہ راست مذہب یا

خاص ہندو مذہب یا اس کے شعائر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی معاملہ مراقبہ کا ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک ان کو اپنے فائدے کے لیے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر ان میں کسی نے اپنے مذہب کی کوئی چیز شامل کی ہے تو اسے چھوڑ دیں۔ باقی کوئی حرج نہیں ہے۔

ابو یحییٰ

قوم ثمود کے آثار

سوال:

السلام علیکم، میری کچھ الجھنیں ہیں قرآنی واقعات سے متعلق مثلاً یہ کہ جدید ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق مدائن صالح، سعودی عرب میں پائے جانے والے آثار اتنے قدیم نہیں ہیں کہ ان کو قوم ثمود سے منسوب کیا جا سکے۔ ان کے مطابق یہ آثار ایک اور قوم سے منسوب ہیں جنھیں نبطی کہا جاتا ہے اور یہ قوم چند صدی قبل از مسیح سے زیادہ پرانی نہیں؟ کیا مسلمانوں کے پاس کوئی تحقیق ہے۔

عرفان رشید

جواب:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے سوال کا جواب مولانا مودودی نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں دیا ہے۔ آپ کی دلچسپی کے لیے ہم سورہ شعراء کے اس اقتباس کو ذیل میں نقل کر دیتے ہیں جس میں انھوں نے اپنے سفر کا احوال بھی ذکر کیا اور اس متعین اعتراض کا جواب بھی دیا۔

''ثمود کی ان عمارتوں میں سے کچھ اب بھی باقی ہیں جنہیں 1959ء کے دسمبر میں میں

نے خود دیکھا ہے۔ مقابل کے صفحات میں ان کی کچھ تصویریں دی جا رہی ہیں۔ یہ جگہ مدینہ طیبہ اور تبوک کے درمیان حجاز کے مشہور مقام العُلاء (جسے عہد نبوی میں وادی القریٰ کہا جاتا تھا) سے چند میل کے فاصلے پر بجانب شمال واقع ہے۔ آج بھی اس جگہ کو مقامی باشندے الحِجر اور مدائنِ صالح کے ناموں ہی سے یاد کرتے ہیں۔ اس علاقے میں العُلاء تو اب بھی ایک نہایت سرسبز و شاداب وادی ہے جس میں کثرت سے چشمے اور باغات ہیں، مگر الحِجر کے در و پیش بڑی نحوست پائی جاتی ہے۔ آبادی برائے نام ہے۔ روئیدگی بہت کم ہے۔ چند کنوئیں ہیں۔ انہی میں سے ایک کنوئیں کے متعلق مقامی آبادی میں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ حضرت صالح کی اونٹنی اسی سے پانی پیتی تھی۔ اب وہ ترکی عہد کی ایک ویران چھوٹی سی فوجی چوکی کے اندر پایا جاتا ہے اور بالکل خشک پڑا ہے۔ اس علاقے میں جب ہم داخل ہوئے تو العلاء کے قریب پہنچتے ہی ہر طرف ہمیں ایسے پہاڑ نظر آئے جو بالکل کِھیل کَھیل ہو گئے ہیں۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ کسی سخت ہولناک زلزلے نے انہیں سطح زمین سے چوٹی تک جھنجوڑ کر قاش قاش کر رکھا ہے (ان پہاڑوں کی بھی کچھ تصویریں مقابل کے صفحات پر دی جا رہی ہیں)۔ اسی طرح کے پہاڑ ہمیں مشرق کی طرف العلاء سے خیبر جاتے ہوئے تقریباً 50 میل تک اور شمال کی طرف ریاست اردن کے حدود میں 30-40 میل اندر تک ملتے چلے گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تین چار سو میل لمبا اور 100 میل چوڑا ایک علاقہ تھا جسے ایک زلزلہ عظیم نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ثمود کی جو عمارتیں ہم نے الحجر میں دیکھی تھیں، اسی طرح کی چند عمارتیں ہم کو خلیج عقبہ کے کنارے مدین کے مقام پر، اور اردن کی ریاست میں پٹرا (Petra) کے مقام پر بھی ملیں۔ خصوصیت کے ساتھ پٹرا میں ثمود کی عمارات اور نَبطیوں کی بنائی ہوئی عمارات پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور ان کی تراش خراش اور طرز تعمیر میں اتنا نمایاں فرق ہے کہ ہر شخص ایک نظر دیکھ کر ہی سمجھ سکتا

ہے کہ یہ دونوں نہ ایک زمانے کی ہیں اور نہ یہ ایک ہی قوم کا طرزِ تعمیر ہے (ان کے الگ الگ نمونوں کی تصویریں بھی ہم نے مقابل کے صفحات میں دی ہیں)۔ انگریز مستشرق ڈاٹی (Daughty) قرآن کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے الحجر کی عمارات کے متعلق یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ ثمود کی نہیں بلکہ، نبطیوں کی بنائی ہوئی عمارات ہیں۔ لیکن دونوں قوموں کی عمارات کا فرق اس قدر واضح ہے کہ ایک اندھا ہی انہیں ایک قوم کی عمارات کہہ سکتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ پہاڑ تراش کر ان کے اندر عمارتیں بنانے کا فن ثمود سے شروع ہوا، اس کے ہزاروں سال بعد نبطیوں نے دوسری اور پہلی صدی قبل مسیح میں اسے عروج پر پہنچایا، اور پھر ایلورہ میں (جس کے غار پڑا سے تقریباً سات سو برس بعد کے ہیں) یہ فن اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ (3/523)

ابو یحییٰ

سلسلہ روز و شب

ابو یحییٰ

حادثہ، اتفاق اور ارادہ

حادثہ کیوں ہوا، کیسے ہوا؟

یہ مارچ، 2014 کی 8 تاریخ تھی۔ ملائیشین ایئر لائن کا ایک جہاز MH370 کوالالمپور ایئر پورٹ سے بیجنگ جانے کے لیے روانہ ہوا۔ جہاز کے عملے اور مسافروں کو ملا کر 239 افراد جہاز میں سوار تھے۔ جہاز کی روانگی کے ایک گھنٹے بعد کنٹرول ٹاور سے اس جہاز کا رابطہ آخری دفعہ ہوا۔ یہ اس وقت چین کی جانب محو پرواز تھا۔ پھر اس کا رابطہ منقطع ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد یہ طیارہ ملائیشیا کے فوجی ریڈار پر بالکل مخالف سمت جاتے ہوئے نظر آیا۔ تاہم اس کے بعد بھی جہاز کا رابطہ ایک سیٹلائٹ سسٹم سے رہا جس کا مقصد زمین سے جہاز پر فون کال وصول کرنا تھا۔ اس سسٹم کے مطابق جہاز آسٹریلیا کے نزدیک بحر ہند کے جنوب میں پرواز کر رہا تھا۔

اس جہاز کو تلاش کرنے کی مہم ہفتوں تک چلتی رہی۔ آخر کار تحقیق کرنے والے اس نتیجے پر پہنچے کے جہاز نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر پرواز کے ایک گھنٹے بعد اپنا رخ بدلا اور چین جانے کے بجائے بالکل مخالف سمت میں بحر ہند کے جنوبی حصے کی سمت روانہ ہو گیا۔ اور آخر کار ایندھن کے ختم ہو جانے کے بعد سمندر میں گر کر تباہ ہو گیا۔ سر توڑ کوشش کے باوجود جہاز کا ملبہ دستیاب نہ ہو سکا۔

سوا برس گزر گیا اور لوگ اس واقعے کو بھول گئے کہ 29 جولائی 2015 کے دن ایک نامعلوم جہاز کا ایک بازو یا ونگ بحر ہند میں افریقہ کی سمت واقع ری یونین جزیرے کے ساحل پر پایا گیا۔ تجزیے سے معلوم ہوا کہ یہ ایک بوئنگ جہاز کا ونگ ہے۔ چونکہ بحر ہند میں ایک ہی بوئنگ طیارہ غائب تھا اس لیے تمام لوگوں کا ذہن اسی سمت میں گیا کہ یہ ملائیشین ایئر لائن کے طیارے کا

ونگ ہے۔ چنانچہ اس ونگ کو اب فرانس بھیج دیا گیا ہے جہاں ماہرین یہ کوشش کریں گے کہ اس کا تفصیلی تجزیہ کرکے کوئی ایسا نشان، سیریل نمبر یا اور کوئی شناخت ڈھونڈی جائے جس سے یہ ثابت ہوجائے کہ یہ بازو اسی بدقسمت طیارے کا ہے۔

فضائی سفر دنیا بھر میں محفوظ سفر سمجھا جاتا ہے اور اس طیارے میں ویسے ہی 15 ملکوں کے لوگ سوار تھے اس لیے بین الاقوامی میڈیا میں اس حادثے کی بہت تشہیر ہوئی تھی اور جب اس کا بازو ملا تو ایک بار پر پھر عالمی ذرائع ابلاغ میں یہ خبر زیر بحث آ گئی۔ میں سی این این پر جہاز کے بازو کے ملنے کے حوالے سے ایک رپورٹ دیکھ رہا تھا کہ رپورٹر نے ایک بہت اہم جملہ کہا۔ اس نے یہ بتاتے ہوئے کہ یہ بازو اب فرانس کی ایک لیبارٹری میں بھیجا جارہا ہے جہاں اس کا تفصیلی معائنہ ہوگا۔ اس سے یہ تو نہیں بتایا جاسکتا کہ یہ حادثہ کیوں ہوا لیکن یہ معلوم کرنے میں مدد ملے گی کہ یہ حادثہ کیسے ہوا۔

کچھ اسباق

جہاز کے اس حادثے میں کئی اہم اسباق ہیں۔ پہلا اور اہم سبق یہ ہے کہ انسان ہر حال میں یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کوئی واقعہ کیوں اور کیسے ہوا۔ یہی چیز انسان کو انسان بناتی ہے اور یہی وہ سوالات ہیں جن میں سے پہلے یعنی دنیا اور اس کا نظام کیسے چلتا ہے کا جواب سائنس دیتی ہے اور دوسرے سوال یعنی دنیا کیوں بنی، ہم یہاں کیوں ہیں وغیرہ کا جواب مذہب دیتا ہے۔

ایک دوسرا اہم سبق انسان کی سائنسی ترقی ہے۔ آج کے دور میں ہم ہزاروں میل کا سفر ہوائی جہاز کے ذریعے سے چند گھنٹوں میں طے کرسکتے ہیں۔ ہوائی جہاز کا سفر انتہائی تیز رفتار اور خطرناک ہوتا ہے، مگر ٹیکنالوجی کی مدد سے اس سفر کو اتنا زیادہ محفوظ بنا دیا گیا ہے کہ دنیا بھر میں سب سے کم لوگ فضائی حادثات میں مرتے ہیں۔ ہر روز ہزاروں پروازوں کے ذریعے سے

لاکھوں لوگ سفر کرتے ہیں اور ایک ہوائی جہاز زمین و آسمان کی تمام خوفناک فطری طاقتوں کا مقابلہ کرتا ہوا اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔

اس سفر کے دوران میں جہاز جس فضا میں پرواز کرتا ہے اس کا درجہ حرارت منفی 40 تک ہوتا ہے جہاں سانس بھی نہیں لیا جاسکتا مگر جہاز کے اندر مسافروں کے لیے انتہائی خوشگوار ماحول فراہم کیا جاتا ہے۔ اس دوران میں جہاز کا رابطہ مسلسل زمینی عملے سے رہتا ہے اور جیسا کہ پیچھے بیان ہوا کہ اب عام لوگ بھی سیٹلائٹ کی مدد سے زمین پر ٹیلیفون پر رابطہ کرسکتے ہیں۔

انسان کی ناشکری

زمانہ قدیم میں یہ نعمتیں کسی بادشاہ کو بھی حاصل نہیں تھیں۔ بادشاہ بھی سفر کرتے تو سردی گرمی جھیلتے، راستے کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے میلوں کا سفر دنوں میں طے کرتے تھے۔ مگر آج کا انسان ان نعمتوں کو پاکر بالکل غافل ہوچکا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ انسان اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنتا جس نے یہ ساری نعمتیں اس کے لیے مسخر کی ہیں، مگر دور جدید کے انسان کا یہ المیہ ہے کہ وہ خود وجود باری تعالیٰ ہی کا منکر ہوگیا۔ الحاد اور انکار خدا کی تحریک دنیا بھر کے ذہین افراد کو متاثر کرچکی ہے اور انٹرنیٹ، سیٹلائٹ وغیرہ کے ذریعے سے ہمارے ہاں بھی عام لوگ اس کے اثرات قبول کررہے ہیں۔

اس بات کو میں نے اپنی مختلف تحریروں اور خاص کر اپنی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ''کھول آنکھ زمیں دیکھ'' میں تفصیل سے بیان کرچکا ہوں کہ الحاد کی یہ سوچ اب جدید دنیا کی غالب سوچ ہے۔ مذہب کو بس ایک ثقافتی مظہر سمجھا جاتا ہے اور کچھ نہیں۔ یہ بھی میں نے بارہا بیان کیا ہے کہ الحاد کی اس فکر کی مقبولیت کی اصل وجہ یہ نہیں کہ دور جدید میں سائنس دانوں نے خدا کے نہ ہونے کا کوئی ثبوت دریافت کرلیا ہے۔ بلکہ اصل وجہ اہل مذہب کے انتہا پسندانہ رویے اور

نامعقول افکار ہیں۔غیر مسلموں کے معاملے میں اہل مذہب کے پاس جو تعلیم ہے وہ یا تو دیومالائی کہانیاں ہیں یا پھر تحریف شدہ مذہبی تعلیم ہے۔دیومالائی کہانیوں کی ایک مثال ہندومت ہے جس میں تین سے لے کر تین کروڑ خداؤں اور معبودوں کا تصور پایا جاتا ہے۔تحریف شدہ آسمانی مذہب کی ایک مثال مسیحیت ہے جس میں ایک صالح خاتون کو معاذ اللہ خالق کائنات کی بیگم اور ایک صالح انسان کو اس کا بیٹا بنا دیا گیا ہے۔وہ بیک وقت خدا کو ایک بھی مانتے ہیں اور تین بھی مانتے ہیں۔اس طرح کی چیزوں کو اس جدید سائنسی دور میں کون قبول کرسکتا ہے؟

مسلمان اس اعتبار سے خوش نصیب ہیں کہ ان کا مذہب ہر طرح کی تحریفات سے پاک ہے اور اس کی تعلیمات ایسی تمام لغویات سے پاک ہیں جنھیں جدید سائنس کے دریافت کردہ مسلمہ حقائق بالکل رد کردیتے ہیں۔تاہم اول تو مسلمانوں کو اپنے مذہب کی سچائی کو دوسروں تک پہنچانے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔دوسرے یہ کہ وہ اسلام کی اصل تعلیم یعنی ایمان و اخلاق کے بجائے کچھ اور چیزوں کو دین بنا کر پیش کرتے ہیں۔تیسرے یہ کہ اسلام کے نام پر جو لوگ کھڑے ہوکر بات کرتے ہیں ان میں سے اکثر تہذیب و اخلاق دونوں سے عاری ہوتے ہیں۔ ان سے ذرا سا اختلاف کیا جائے اور پھر جس بدتمیزی اور بدتہذیبی کا رویہ سامنے آتا ہے، اس کے بعد کسی شخص کو ایسے مذہب سے حسن ظن نہیں رہ سکتا جس کے نام پر وہ کھڑے ہوتے ہیں۔چنانچہ مذہب اور اس کی تعلیم زیر بحث نہیں آتی اور عام لوگ اس بداخلاقی کی بنا پر دین ہی سے بےزار ہوجاتے ہیں۔

انسان تو سچائی جاننا چاہتے ہیں۔انسان اعلیٰ اخلاقی تعلیمات سے متاثر ہوتے ہیں۔وہ اپنے ذہن اور زندگی کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانا چاہتے ہیں۔اسلام کے پاس سچائی بھی ہے اور اعلیٰ اخلاقی تعلیمات بھی ہیں۔اس کے پاس ہر ذہن اور زندگی کی ہر الجھن کا مکمل حل ہے۔لیکن سردست

اسلام کے نام پر فرقہ بندی میں گرفتار مسلمان کھڑے ہیں۔جب یہ ایک دوسرے کو کافر اور بددین قرار دینے سے باز نہیں آتے اور ہر طرح کی اخلاقیات سے بلند ہوکر الزام و بہتان کی روش کو اختیار کرتے ہیں تو پھر اس کا تمام تر فائدہ الحاد اور شرک کو ہوتا ہے۔انھیں کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے کہ وہ ایک متبادل بن کر لوگوں کے سامنے آئیں ان کے درمیان جگہ بنائیں۔یہی اس وقت ہو رہا ہے۔

اس کا سب سے المناک پہلو اب یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں الحاد تیزی کے ساتھ فروغ پا رہا ہے۔انٹرنیٹ کے ذریعے سے الحاد و مذہب کے درمیان ایک مکالمہ لوگوں خاص کر ذہین افراد کے سامنے آتا ہے۔اس میں مذہب کی ترجمانی وہی دو عناصر کر رہے ہوتے ہیں۔یعنی تحریف شدہ مذاہب یا پھر اسلام کے نام پر کھڑے ہوئے فرقہ پرست۔نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ ملحد مفکرین کی جیت ہوتی ہے۔اور ہمارے نوجوان بھی تیزی سے متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

الحاد کی علمی اور فکری شکست

حقیقت یہ ہے کہ الحاد کے فروغ کی اصل وجہ یہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ورنہ جہاں تک سائنس اور اس کی دریافتوں کا معاملہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ الحاد کو فکری محاذ پر جس طرح سائنسی ترقیوں نے شکست سے دوچار کیا ہے، اس کی کوئی مثال سابقہ دور میں نہیں ملتی۔

سائنسی نظریات کی بنیاد پر الحاد یا انکار خدا کی بات انیسویں صدی تک کچھ معقول محسوس ہوتی تھی جب جدید سائنس کا ابتدائی دور تھا۔اس دور میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ مادہ ازلی ہے اور کائنات ہمیشہ سے موجود ہے۔ڈارون کے نظریہ ارتقا کے بعد یہ خیال مزید پختہ ہوگیا کہ اس دنیا میں انسان جیسی بلند اور باشعور مخلوق کا ہونا ایک خالق کا ثبوت نہیں بلکہ نظریہ ارتقا سے اس کی توجیہ کرلی گئی۔مگر بیسوی صدی کے آغاز کے ساتھ ہی پے در پے ایسی سائنسی دریافتیں سامنے آئیں جن سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ یہ کائنات کسی بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں نہ یہاں پر موجود حیات

ازل سے موجود اندھے بہرے مادے کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ بگ بینگ تھیوری نے یہ بات واضح کردی کہ کائنات ازلی نہیں بلکہ ایک خاص وقت میں یعنی 13.7 ارب سال قبل تخلیق ہوئی ہے۔ اس کائنات میں قدم قدم پر انتہائی پیچیدہ عمل انتہائی درستی اور ریاضیاتی صحت کے ساتھ جاری و ساری ہیں۔ سوال یہ ہے کہ خود مادہ اپنے اندر یہ خصوصیت کیسے پیدا کرسکتا ہے؟ پھر اس کائنات میں موجود واحد مقام یعنی کرہ ارض جہاں زندگی پائی جاتی ہے، ایک انتہائی حیرت انگیز جگہ ہے۔ یہ ایک ایسی کائنات کا حصہ ہے جسے میں قاتل کائنات کہتا ہوں۔ یعنی یہ زندگی کی ہر شکل کے لیے موت کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر اس سیارے تک آتے ہی یہ کائنات سراپا رحمت بن جاتی ہے۔ توازن اور تناسب کا ایک معجزہ ظہور پذیر ہوتا ہے اور زندگی کے لیے انتہائی موزوں حالات اور لائف سپورٹنگ سسٹم وجود میں آجاتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ ہوا اور فضا جس کے بغیر زندگی یہاں یکلخت ختم ہوجائے گی چند گیسوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں نائٹروجن 78 آکسیجن 21 فیصد کے قریب ہیں جبکہ باقی گیسیں بہت قلیل مقدار میں اس کا حصہ ہیں۔ یہی وہ دو گیسیں ہیں جن کا زندگی کی بقا میں بنیادی حصہ ہے۔ یہ دو گیسیں اگر نہ رہیں یا اگر ان کا تناسب وہ نہ رہے جو اس وقت ہے تو زندگی اس زمین سے ختم ہوجائے گی۔ یہ کسی ایک چیز کا معاملہ نہیں یہاں پائے جانے والے زندگی کے تمام عوامل کا معاملہ ہے۔ مثلاً زمین کا سورج سے فاصلہ اگر زیادہ ہوجائے تو سردی اور کم ہوجائے تو گرمی کی وجہ سے زندگی ختم ہوجائے گی۔

یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جس کا جواب کسی منکر خدا کے پاس نہیں کہ یہاں اس طرح کا نظم اور تناسب کیوں پایا جاتا ہے۔ اس کا ایک بے معنی جواب دے دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اتفاق سے ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایک آدھی چیز ہو تو اس کو اتفاق کہہ دیا جائے۔ مگر جب ''اتفاقات'' اتنے تواتر، اتنی بڑی تعداد اور اتنے بامقصد طریقے پر سامنے آئیں تو ان کو اتفاق

نہیں ارادہ کہا جاتا ہیں۔ درحقیقت زندگی اندھے بہرے مادے میں جنم لینے والا کوئی اتفاق نہیں بلکہ خدا کے ارادے کا نتیجہ ہے اور اسی کے ارادے کی بنا پر ہم سب یہاں موجود ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنس نے ہمیں خدا سے اور قریب کردیا ہے۔ اوپر جہاز کے بازو کے ملنے پر ایک رپورٹر کا جملہ میں نے نقل کیا تھا کہ فرانس کی کی لیبارٹری میں اس بازو کا تجزیہ کرکے یہ تو نہیں بتایا جاسکتا کہ یہ حادثہ کیوں ہوا لیکن یہ بتایا جاسکتا ہے یہ حادثہ کیسے ہوا۔ یہی سائنس کا کام ہے کہ وہ کائنات کے متعلق یہ واضح طور پر بتاتی ہے کہ یہ کیسے بنی اور اس کا نظام کیسے چل رہا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاسکتی کہ یہ کیوں ہوا اور اس کے پیچھے کون ہستی ہے۔ یہ دراصل پیغمبر ہی بتاتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق اللہ رب العزت ہے۔ اس نے یہ دنیا امتحان کے لیے پیدا کی ہے۔ یہاں وہ بندوں کا امتحان لے رہا ہے کہ کون اچھے عمل کرتا ہے۔ عنقریب قیامت آئے گی اور یہ دنیا ختم کی جائے گی۔ پھر ایک نئی دنیا بنائی جائے گی جہاں اللہ تعالیٰ اچھے عمل کرنے والوں کو جنت میں ہمیشہ کی زندگی دیں گے۔ رہے منکرین تو وہ اپنے کیے کا انجام بھگتیں گے۔

غیر متعلق سوالات

منکرین خدا مذہب کے انکار کے لیے ادھر ادھر کے سوالات اٹھاتے رہتے ہیں۔ مثلاً روح کیا ہے۔ خدا کیسے وجود میں آیا۔ یہ کیسی نادانی ہے کہ جو کائنات سامنے ہے اور جس کے متعلق یقینی ہے کہ وہ خود بخود وجود میں نہیں آسکتی، اس کا خود بخود وجود میں آنا تو مانتے ہیں، مگر وہ خدا جس کے متعلق کچھ نہیں جانتے، اس کے متعلق یہ سوال اٹھا دیتے ہیں کہ کیسے وجود میں آیا۔

بہرحال ان میں سے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دیا جاسکتا ہے۔ مگر اسی شخص کو جو پہلے کائنات میں پائے جانے والے نظم اور مقصدیت کی کوئی اور وجہ بیان کردے۔ آج کی تاریخ تک یہ سب سوائے خدا کے کوئی اور نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کا انکار کرنا چاہتے ہیں پہلے وہ کائنات

کی موجودہ ہیت ، وجود، اس کے نظم ومقصدیت اور زندگی کے لیے اس کی موزونیت کی کوئی قابل قبول توجیہہ کے مسئلے سے نمٹ لیں۔ اس کے بعد جو دل چاہے سوال کرلیں۔

جہاں رہیں بندگان خدا کے لیے باعث رحمت بنیے ، باعث آزار نہ بنیے۔

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (22)

دلائل توحید: فطرت

اللہ تعالیٰ کی توحید کے اثبات، اس کی بندگی کی دعوت اور غیر اللہ کی الوہیت، عبادت اور اطاعت کی نفی کے ضمن میں ابھی تک ہم نے قرآن مجید کے دو بنیادی دلائل کا مطالعہ کیا ہے۔ ایک ربوبیت اور دوسرا اقدرت۔ ربوبیت کا مطلب یہ ہے کہ جس رب نے ساری نعمتیں دی ہیں تنہا وہی عبادت کے لائق ہے۔ قدرت کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں سارا اختیار اور اقتدار اور نفع وضرر کا سارا معاملہ سرتا سر اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جبکہ اللہ کے سوا جن معبودان باطل کی عبادت کی جاتی ہے، نہ ان کا خدائی میں کوئی حصہ ہے اور نہ وہ یہ طاقت ہی رکھتے ہیں کہ کسی کی کچھ دادرسی کرسکیں۔ جب اختیار اور نفع تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہے تو وہی عبادت کے لائق ہے اور اس کے سوا کوئی اور ہستی عبادت کی مستحق نہیں۔

انسانی فطرت سے استدلال

قرآن مجید ایک تیسرے پہلو سے بھی لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت رکھتا ہے۔ یہ انسان کے اندر موجود فطرت کا پہلو ہے۔ قرآن کریم اپنے مخاطبین کو یہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ایک ایسی فطرت پر پیدا کیا ہے جس کا دین شرک نہیں بلکہ ایک اللہ کی بندگی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

”پس تم اپنا رخ یکسو ہوکر دینِ حنیفی کی طرف کرو۔ اس دینِ فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو تبدیل کرنا جائز نہیں ہے۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف متوجہ ہوکر اور اسی سے ڈرو اور نماز کا اہتمام رکھو۔ اور

تم لوگ مشرکین میں سے نہ بنو''   (سورہ روم آیات 30-31:30)

ان آیات میں یہ بالکل واضح کر دیا گیا ہے کہ بندگی کی جس دعوت کو لے کر انبیا علیہم السلام آئے ہیں اور جسے قرآن مجید جگہ جگہ ''ذکر'' اور ''ذکریٰ'' یعنی یاد دہانی کے عنوان سے بیان کرتا ہے وہ انسانوں کے لیے کوئی اجنبی شے نہیں ہے۔ بلکہ وہ فطرت کی اس پکار کا جواب ہے جو انسانوں کے اندر سے اٹھتی ہے اور جس پر انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ یہ پکار اتنی واضح ہے کہ کئی مقامات پر قرآن مجید میں اسے ''بینة''، (مثلاً دیکھیے ہود 28:11) یعنی روشن دلیل قرار دیا گیا ہے۔ یہ پکار انسان کو بتاتی ہے کہ خدا ہے اور اس جیسا کوئی نہیں۔ انبیا علیہم السلام اپنی فطرت کی پاکیزگی کی بنا پر صرف اسی ''بینة'' کی بنیاد پر نبوت ملنے سے قبل ہی توحید پر قائم رہتے ہیں اور ان کا دامن کبھی شرک سے آلودہ نہیں ہوتا۔ جبکہ عام لوگ جب انبیا علیہم السلام کی دعوت کو سنتے ہیں تو ان کی روشن فطرت پر جو پردے پڑے ہوتے ہیں وہ ہٹ جاتے ہیں اور ان میں سے سلیم الفطرت لوگ آگے بڑھ کر اس یاد دہانی کو قبول کر لیتے ہیں۔

قرآن کریم مزید یہ بھی واضح کرتا ہے کہ فطرت کا یہ شعور جسے لے کر انسان اس دنیا میں آتا ہے ایک خصوصی معاملہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس دنیا میں امتحان کی غرض سے بھیجتے وقت زادراہ کے طور پر ان کے ہمرکاب کیا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''اور یاد کرو، جب تمھارے پروردگار نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی اولاد کو نکالا اور اُنھیں خود اُن کے اوپر گواہ بنا کر پوچھا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اُنھوں نے جواب دیا: ضرور، آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اِس پر گواہی دیتے ہیں۔ یہ ہم نے اِس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اِس سے بے خبر ہی تھے یا اپنا عذر پیش کرو کہ شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے پہلے سے کر رکھی تھی اور ہم بعد کو اُن کی اولاد ہوئے ہیں، پھر آپ کیا اِن غلط کاروں کے عمل کی پاداش میں ہمیں ہلاک کریں گے؟ ہم اِسی طرح اپنی آیتوں کی تفصیل

کرتے ہیں، (اِس لیے کہ لوگوں پر حجت قائم ہو) اور اِس لیے کہ وہ رجوع کریں۔''
(الاعراف 172-174:7)

قرآن مجید کے نزدیک انسان کی اس روشن فطرت کا ماخذ یہی واقعہ ہے۔ اسی واقعے کی بنیاد پر انسان ہمیشہ یہ بات یاد رکھتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے۔ اس کا ماحول اور اس کے باپ دادا اس کی فطرت کو کسی بھی طرح مسخ کریں، اس کے نہاں خانہ دل میں اس واقعے کی یاد ہمیشہ باقی رہتی ہے اور اگر وہ اپنے ماحول اور حالات کا چڑھایا ہوا خول اتارنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ جان لے گا کہ ایک اللہ کا اعتراف اور اس کی عبادت عین اس کی فطرت ہے۔

رہی یہ بات کہ یہ اگر حقیقی واقعہ ہے تو انسانوں کو یاد کیوں نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ اگر یاد رہتا تو پھر امتحان ختم ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ واقعہ اپنی تفصیل میں انسانوں کو چاہے نہ یاد ہو مگر اپنے اثرات کے لحاظ سے ہمیشہ ان کے لاشعور کا حصہ بنا رہتا ہے۔ اس کی مثال بچپن میں پیش آنے والے ان واقعات کی ہے جو بڑے ہو جانے پر انسانوں کو یاد تو نہیں رہتے، مگر ان کے اثرات تا زیست انسانی نفسیات پر اپنے اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔

انسانوں کا اعتراف اور عمل

قرآن مجید ایک دوسرے پہلو سے فطرت کی دلیل کو نمایاں کرتا ہے۔ وہ جگہ جگہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ وہ لوگ جو بتوں کے پجاری اور دیوی دیوتاؤں کے اسیر ہوتے ہیں، غیر اللہ کو پکارنا عبادت اور زندگی سمجھتے ہیں، وہ بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ جن معبودان باطل کی وہ عبادت کرتے ہیں، ان کا آسمان و زمین کی پیدائش میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اسی طرح کائنات کا نظام چلانا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''ان سے پوچھو، یہ زمین اور جو اس میں ہیں کس کے ہیں، اگر تم جانتے ہو! کہیں گے اللہ کے۔

کہوتو کیا تم اس سے یاد دہانی نہیں حاصل کرتے! پوچھو، ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا
خداوند کون ہے؟ کہیں گے یہ سب اللہ کے ہیں۔ کہوتو کیا تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں! پوچھو، وہ
کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے، لیکن اس کے مقابل میں پناہ
نہیں دی جاسکتی، اگر تم جانتے ہو! وہ کہیں گے یہ باتیں اللہ ہی کے اختیار کی ہیں، کہو پھر تمہاری
مت کہاں ماری جاتی ہے۔ (مومنون 23 :84-89)

''اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو جواب دیں گے اللہ نے،
کہو شکر کا سزاوار بھی اللہ ہے۔ بلکہ ان کے اکثر اس بات کو نہیں جانتے۔'' (لقمان 31:25)

''اور اگر تم ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا تو وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے تو پھر کہاں
بھٹک جاتے ہیں!'' (زخرف 43 :87)

یہی وہ لوگ ہیں جن کی فطرت پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور جو اپنی خواہشات اور تعصّبات
کی بنا پر غیر اللہ کے سامنے گردن تو جھکا دیتے ہیں، مگر جب کبھی مصیبت و پریشانی ان کے بس
سے باہر ہو جاتی ہے تو آخر کار یہ تڑپ کر اللہ وحدہ لاشرک ہی کو پکارتے ہیں۔

'' کہہ دو بتاؤ، اگر تم پر اللہ کا عذاب آجائے یا قیامت آدھمکے تو کیا تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو
گے، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو؟ بلکہ اسی کو پکارو گے تو وہ دور کر دیتا ہے اس مصیبت کو جس
کے لیے تم اس کو پکارتے ہو اگر چاہتا ہے اور جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ان کو بھول جاتے ہو''
(انعام 6 :40-41)

''ان سے پوچھو، خشکی اور تری کی تاریکیوں میں سے تم کو کون نجات دیتا ہے جبکہ اسی کو تم
پکارتے ہو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے کہ اگر اس نے ہم کو نجات دے دی اس مصیبت سے تو ہم اس
کے شکر گزار بندوں میں سے بن جائیں گے؟ کہہ دو اللہ ہی تم کو نجات دیتا ہے اس مصیبت
سے بھی اور دوسری ہر تکلیف سے لیکن تم پھر شرک کرنے لگتے ہو'' (انعام 6 :63-64)

''اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تب تو لیٹے، بیٹھے یا کھڑے ہم کو
پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو اس طرح چل دیتا ہے گویا کسی تکلیف
کے لیے، جو اس کو پہنچی، اس نے ہم کو پکارا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح حدود سے تجاوز کرنے والوں
کی نگاہوں میں ان کے اعمال کھبا دیے گئے ہیں (یونس 10 :12)

''وہی ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور
کشتیاں ہوائے موافق سے چل رہی ہوتی ہیں اور وہ اس میں مگن ہوتے ہیں کہ دفعتہً ایک باد
تند آتی ہے اور ان پر ہر جانب سے موجیں اٹھنے لگتی ہیں اور وہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ہم ہلاک
ہوئے تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں خالص اسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہمیں اس
آفت سے نجات دی تو ہم تیرے شکر گزار بندوں میں سے ہو کر رہیں گے۔''
(یونس 10 :22)

''اور جب تمہیں سمندر میں مصیبت پہنچتی ہے تو اس کے سوا جن کو تم پکارتے ہو سب غائب ہو
جاتے ہیں۔ پھر جب وہ تم کو خشکی کی طرف بچالاتا ہے تو تم اعراض کر بیٹھتے ہو اور انسان بڑا ہی
ناشکرا ہے۔'' (بنی اسرائیل 17 :67)

''پس جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اللہ کو پکارتے ہیں اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے
ہوئے۔ پس جب ان کو خشکی کی طرف نجات دے دیتا ہے تو پھر وہ اس کے شریک ٹھہرانے
لگتے ہیں۔'' (العنکبوت 29 :65)

یہی فطرت کی وہ پکار ہے جو اس بات کا سب سے بڑھ کر ثبوت ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود
نہیں اور وہی بندگی اور عبادت کے لائق ہے۔

[جاری ہے]

نواں اصول: پڑوسیوں کے ساتھ بھلائی مہمان داری اور صلہ رحمی

مسلمان گھر مہمان داری کا مرکز ہوتا ہے۔اس کی مہمان داری صرف اپنوں سے ہی نہیں ہوتی بلکہ جو بھی وہاں مہمان بن کر آتا ہے اس کی مہمان داری کرنا چاہیے۔اس میں کوئی ملاوٹ اور بناوٹ نہیں ہونی چاہیے۔تکلف بخل کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔اگر تکلف کا یہ سلسلہ جاری رہے تو میز بان کی جیب پر بلاوجہ بوجھ پڑتا ہے۔وہ آخر کار بخل پر اتر آتا ہے۔چنانچہ مہمان کو بھی چاہیے کہ وہ میز بان کو کلفت اور تنگی میں نہ ڈالے۔اگر مہمان کو محسوس ہو کہ میز بان کے لیے ان سہولیات کا مہیا کرنا مشکل ہے تو مہمان کو چاہیے کہ وہ طریقے اور حکمت سے معاملات کو لے کر چلے۔وہ میز بان کے لیے زحمت کا باعث نہ بنے۔

مسلمان گھرانے کی یہ بھی خوبی ہوتی ہے کہ وہ صلہ رحمی کرتا ہے۔مومن کو چاہیے کہ اپنے عزیز واقارب کے دکھ درد میں شریک ہو۔خاص مواقع پر ان کو ہدیے اور تحائف دے۔ان کا ادب احترام کرے، پڑوسیوں کے معاملے میں بھی اسلامی گھرانے کو محتاط ہونا چاہیے وہ ان کے لیے اذیت اور تکلیف کا باعث نہ بنے' ان کے حقوق ادا کرے۔ان کے دکھ درد میں بھرپور انداز میں شریک ہو' ان کی اولاد و اموال کی حفاظت کرے' ان کے راز کی پردہ داری کرے' اپنے نفس کا محاسبہ کرتے ہوئے ان کے ساتھ ظلم وزیادتی نہ کرے۔

[نوٹ یہ سلسلہ مضامین سعید حویٰ کی تصنیف ''البیت المسلم'' کی تلخیص وترجمہ پر مشتمل ہے]

پروفیسر محمد عقیل

بدگمانی

بدگمانی کیا ہے؟کسی کے بارے میں برا سوچنا،اس کے بارے میں غلط اندازے لگانا اور پھر ان اندازوں اور مفروضوں کی بنیاد پر کوئی اقدام کر گزرنا۔بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ہمیں کسی سے کوئی شکایت ،کوئی تکلیف،کوئی اختلاف یا کوئی پریشانی ہوجاتی ہے۔اب ہم اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ اس نے ایسا رویہ کیوں اختیار کیا،ایسا منہ کیوں بنایا، کیوں وہ اس وقت خاموش رہا وغیرہ۔

یہ بظاہر ایک نارمل سی بات ہے جو ہمارے ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔دراصل ہم کسی کے غلط رویئے کی توجیہہ کرنا چاہتے ہیں۔چونکہ بات عام طور پر باڈی لینگویج میں ہوتی ہے اس لئے ہم اس سے براہ راست اس رویئے کی وجہ بھی نہیں پوچھ پاتے۔یہیں سے گمانوں کا سفر شروع ہوتا ہے،یہیں سے ہم ٹوہ لینا شروع ہوجاتے ہیں،یہیں سے ہم اندازوں میں غلطاں ہوجاتے ہیں کہ شاید یہ وجہ ہوگی یا وہ وجہ۔

اس منفی سوچ کے موقع کو شیطان بہت آسانی سے استعمال کرتا اور ہمارے ذہن میں اپنے بھائی یا بہن کے خلاف سوچیں پیدا کرتا ہے۔وہ یہ خیال دل میں ڈالتا ہے کہ ضرور وہ تمہارا مخالف ہے،ضرور وہ تمہیں ناپسند کرتا ہے، وہ ضرور کسی سازش میں مصروف ہے، وہ ضرور کوئی کاروائی کرنا چاہتا ہے وغیرہ۔

بدگمانی کی حقیقت کو دیکھا جائے تو کچھ نہیں محض ایک مفروضہ ہے جس کا کوئی نہ کوئی نقطہ آغاز ہوتا ہے۔مثال کے طور پر اگر کسی نے ہمارے سوال کا جواب نہیں دیا تو یہاں سے ہم نے اس کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔بدگمانی کی ابتدا ہوئی اور دماغ میں سوچیں چلنا شروع

ہوگئیں۔"اس نے جواب اس لئے نہیں دیا کہ شاید وہ مجھے کمتر سمجھتا ہے، شاید وہ بات نہیں کرنا چاہتا، شاید وہ مغرور ہے، شاید وہ امیر ہے اور میں غریب، شاید یہ شاید وہ۔" اب اس واقعے کے بعد ہم اس شخص کو اپنے انہی مفروضات کی روشنی میں دیکھنا شروع ہوجاتے ہیں۔ پھر ہمیں اس کی چال میں بھی تکبر نظر آنے لگتا، اس کی بول چال تحقیر آمیز لگتی اور اس کا طرز زندگی بناوٹی لگتا ہے۔

بدگمانی ایک مفروضہ ہے جو اگر درست ہو بھی جائے تو بھی ہماری زندگی پر کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن اگر یہ غلط ہوجائے تو ہماری زندگی کے کئی قیمتی لمحات ضائع ہوجاتے ہیں۔ ہماری بدگمانی سے سامنے والے کو کوئی نقصان نہیں ہوتا بلکہ ہم خود ہی غلط اندازوں کی بنیاد پر جلتے اور کڑھتے رہتے ہیں۔ کبھی حسد کا شکار ہوجاتے، کبھی غصے میں مٹھیاں بھینچتے، کبھی کسی انتقامی کاروائی کا سوچتے، کبھی مزا چکھانے کا خیال دل میں لاتے تو کبھی کسی سازش کے تانے بانے بننے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ دوسری جانب جب وہ شخص ہم سے ملتا ہے تو پرسکون ہوتا ہے۔ اس کا سکون دیکھ کر تن بدن میں اور آگ لگ جاتی ہے اور ایک اور بدگمانی کا اضافہ ہوجاتا ہے کہ شاید یہ ہمیں مزید مشتعل کررہا ہے۔

بدگمانی کا اصل سبب سوچنا اور غلط سوچنا ہے۔ اس کا علاج سوچنے سے گریز کرنا یا خوش گمانی ہے۔ ہمیں ہر اس مفروضے، اندازے، تخمینے اور سوچ کو قابو کرلینا چاہئے جس سے بدگمانی پیدا ہو۔ ہمیں ہر صورت میں اپنے بھائی یا بہن کو انسان سمجھنا چاہیے کہ ممکن ہے اس سے غلطی ہوگئی ہو، ممکن ہے وہ بھول گیا ہو، ممکن ہے وہ پریشانی کی وجہ سے ایسا کر گیا ہو وغیرہ۔ بدگمانی کا علاج مثبت سوچ، دوسروں کو معاف کردینا، ان کی کوتاہیوں سے صرف نظر کرنا، ان کو مجبوریوں کا مارجن دینا اور ان سے یکطرفہ محبت کرنا ہے۔ بصورت دیگر ہم مفروضوں کی بنیاد پر عین ممکن ہے کوئی ایسا اقدام کربیٹھیں جس سے ہماری دنیا و آخرت دونوں متاثر ہوں۔

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (25)

اگر کسی ملک میں متعدد مذاہب کے لوگ رہتے ہوں اور وہ سیکولرازم کو اختیار کرلیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ مذہب ایسا معاملہ ہے جس میں انسان جذباتی ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ ہرگز قبول نہیں کرسکتا کہ اس پر کسی دوسرے مذہب کے قوانین مسلط کیے جائیں۔ ذرا دیر کے لئے تصور کیجیے کہ کسی دوسرے مذہب کا حکمران آپ پر زبردستی اپنے مذہب کو مسلط کرے تو آپ کی جذباتی کیفیت کیا ہوگی۔ یہی معاملہ مسلم ممالک میں رہنے والے غیر مسلموں کا ہے۔ انہیں بھی اپنے مذہب سے محبت ہوتی ہے۔ اگر ہم اسلام کو زبردستی ان پر مسلط کریں گے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلے گا کہ یہ لوگ اسلام ہی سے متنفر ہوجائیں گے۔

ایسی صورت میں یقیناً سیکولرازم سے بہتر کوئی حل نہیں ہے۔ جدید دور میں اس کی بڑی اچھی مثال ہندوستان ہے جہاں بہت سے مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔ اگرچہ یہاں اکثریت ہندو مذہب کے ماننے والوں کی ہے مگر خود ہندومت میں اس قدر فرقے ہیں کہ ہندومت نافذ کرنا عملاً ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر مذہب اور فرقے سے تعلق رکھنے والے افراد کے لئے ان کا ایک پرسنل لاء ہے۔ اجتماعی معاملات کو سیکولر طریقے سے چلایا جاتا ہے۔

دین اسلام تھیوکریسی اور سیکولرازم دونوں سے مختلف تصور پیش کرتا ہے۔ اسلام میں مذہبی طبقے کے اقتدار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں پاپائیت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسلام میں ہر شخص کا تعلق براہ راست خدا سے ہوتا ہے۔ اسے خدا سے تعلق پیدا کرنے کے لئے کسی واسطے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسلام قطعی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی مذہبی شخص، خدا کے نام پر اپنا اقتدار قائم کرے۔ ایک صاحب علم کے الفاظ میں اسلام میں ہر شخص اپنا پوپ خود ہی ہوا کرتا ہے۔

دوسری طرف اسلام کا سیاسی تصور سیکولرازم سے مختلف ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ دین میں پورے کے پورے داخل ہوں، اس کے تمام احکام کو مانیں اور ان پر عمل کریں۔ دین پر جزوی عمل کی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔ کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ذاتی زندگی میں تو دین کے احکام پر عمل کروں گا مگر اجتماعی زندگی میں، دین سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا۔

جدید دور میں مذہبی ریاست کے بارے میں چند اور سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ قرون وسطی میں تو بادشاہت اور مذہبی راہنماؤں کے گٹھ جوڑ سے یہ معاملہ چل گیا۔ جدید جمہوری دور میں اس کی صورت کیا ہونی چاہیے؟ میری نظر میں اس مسئلے کا سب سے بہترین حل پاکستان کے 1973ء کے آئین میں پیش کیا گیا ہے۔ اس بات سے ان لوگوں کو حیرت ہوگی جو کہ پاکستان کی ہر شے کو کمتر سمجھتے ہیں اور کسی بھی معاملے میں مثال کے لئے باقی دنیا کی طرف دیکھتے ہیں۔

پاکستان آئینی طور پر ایک اسلامی جمہوری ریاست ہے۔ یہ تھیوکریٹک اسٹیٹ نہیں ہے جس میں مذہبی راہنماؤں کا ایک ٹولہ اپنی پسند و ناپسند کو خدا کے نام پر لوگوں پر مسلط کر سکے۔ آئین کے مطابق پاکستان کے قانون ساز ادارے عوام کے ووٹ سے منتخب ہوتے ہیں اور انہیں قانون سازی کا اختیار حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ ارکان پارلیمنٹ کا عالم دین ہونا ضروری نہیں ہے۔ ان کے لئے یہ طے کرنا ایک مشکل کام ہے کہ کوئی قانون بناتے ہوئے اللہ تعالی کے احکام کی خلاف ورزی نہ ہو۔ اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک آئینی ادارہ ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کے نام سے بنایا گیا ہے۔

یہ مختلف مکاتب فکر کے اہل علم پر مشتمل ایک ادارہ ہے جو پارلیمنٹ کے لئے مشاورتی کردار ادا کرتا ہے۔ یہاں قوانین کے مسودوں کا شریعت کے ماخذوں کی روشنی میں جائزہ لیا جاتا ہے اور اپنی سفارشات پارلیمنٹ کے سامنے پیش کر دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد ان سفارشات کی روشنی میں قانون کے مسودے میں ضروری تبدیلیوں کے بعد اسے پارلیمنٹ سے منظور کروا لیا جاتا

ہے۔ اگر کوئی شہری یہ سمجھتا ہے کہ کسی قانون کی کوئی شق قرآن و سنت کے منافی ہے تو وہ اس قانون کو آئینی عدالتوں میں چیلنج کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ غیر مسلم اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی دی گئی ہے اور اسلام کو ان پر زبردستی مسلط نہیں کیا گیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ وہ ممالک جو جمہوریت اور شرعی قانون کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے پاکستان کے نظام میں ایک مثال موجود ہے۔ اس صورتحال کو مزید بہتر کیا جا سکتا ہے۔ انتخاب کے بعد ارکان پارلیمنٹ کو ضروری اخلاقی اور دینی تعلیم دی جانی چاہیے تاکہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو سمجھ سکیں۔

اس ضمن میں ایک اور اچھی مثال ملائشیا نے قائم کی ہے۔ ان کی آبادی کا ساٹھ فیصد حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ملائشیا میں حکومت کی سطح پر اسلامی قوانین نافذ ہیں مگر ان کا اطلاق صرف مسلمانوں پر کیا جاتا ہے۔ اس طریقے سے غیر مسلم اقلیتوں کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ اسلام کو ان پر جبراً مسلط کیا جا رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں ان کی مذہبی آزادی برقرار رہتی ہے اور انہیں اپنی آزادانہ مرضی سے اسلام قبول کرنے یا نہ کرنے کا موقع حاصل رہتا ہے۔ مسئلے کا یہ حل کوئی نیا نہیں بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہود پر تورات ہی کے قوانین نافذ کیے جاتے تھے۔ مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تاریخ میں یہی حل اختیار کیا گیا۔ اسلام کو جبراً مسلط کر دینے سے غیر مسلموں کے دل میں اسلام کی محبت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس ایسا کرنا انہیں اسلام سے دور لے جا سکتا ہے۔

ایک مذہبی جمہوری ریاست میں ایک مسئلہ اور پیدا ہو جاتا ہے۔ تجربے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی راہنما اگر سیاست میں آئیں تو وہ سیاست کو تو کیا دین کے مطابق کریں گے، وہ خود سیاست کی کرپشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے پاکستان میں مذہبی سیاستدانوں میں سیکولر

سیاستدانوں سے شاید زیادہ کرپشن پائی جاتی ہے۔ مذہب کے نام پر لوگوں کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ انہیں سڑکوں پر لا کر دوسروں کی حق تلفی کروائی جاتی ہے۔ پرمٹ حاصل کیے جاتے ہیں۔ عوام کے فنڈز خورد برد کیے جاتے ہیں۔ مذہب کو کمائی کا ذریعہ بنا لیا جاتا ہے۔ خدا کے نام پر نفرتیں پھیلائی جاتی ہیں۔ لوگوں کو تقسیم کیا جاتا ہے۔ لاشوں کی سیاست کی جاتی ہے۔ یہ سب وہ کرتے ہیں جو خود کو ''اسلامی سیاستدان'' کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ صورتحال صرف مذہبی ریاست کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ سیاست میں اس قسم کی کرپشن مذہبی اور سیکولر ہر قسم کی ریاستوں میں پائی جاتی ہے۔ دنیا میں بہت سے ایسے ممالک موجود ہیں جو خود کو سیکولر کہتے ہیں اور وہاں مذہب نہیں بلکہ کسی اور نام سے اسی طرح کی کرپشن پائی جاتی ہے۔ اس کا حل سیاست اور مذہب کو الگ کرنا نہیں ہے بلکہ معاشرے کی اخلاقی تربیت ہے جس کا تقاضا نہ صرف تمام مذاہب کرتے ہیں بلکہ خود جدید سیکولر معاشروں میں اس کو بے پناہ اہمیت دی جاتی ہے۔

ترکی ایسا ملک ہے کہ جس کی 99 فیصد آبادی مسلمان ہے۔ اوپر دی گئی تفصیل کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہیں ہے کہ مصطفیٰ کمال نے مغرب کی اندھی تقلید میں ترکی پر جو سیکولرازم مسلط کیا اور مذہب کو زندگی کے ہر معاملے سے نکالنے کی جو کوشش کی، اس کے نتیجے میں ترکی میں ایک عجیب قسم کا تضاد اور منافقت پیدا ہو گئی ہے۔ اہل ترکی بڑے فخر سے خود کو مسلمان کہتے ہیں۔ اپنے انفرادی معاملات میں یہ اللہ کے احکام کی پیروی کرتے ہوں گے مگر اجتماعی معاملات میں اس کے احکام کی پیروی نہیں کی جاتی۔ اس طرح گویا اہل ترکی اللہ تعالیٰ سے کہہ رہے ہوتے ہیں: ''یا اللہ! ہم تیرے بندے ہیں۔ اپنی انفرادی زندگی میں تو ہم تیرے ہر حکم کی پیروی کریں گے مگر جہاں اجتماعی معاملات درپیش ہوں گے، وہاں ہم تیرے بندے نہیں رہیں گے۔''

عثمانی بادشاہت کا خاتمہ

ہمارے برصغیر کے لوگ سلطنت عثمانیہ کے خاتمے پر بڑے جز بز ہوئے اور انہوں نے 1919ء میں ایک بہت بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ان کے خیال میں یہ خلافت کا خاتمہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت راشدہ کا خاتمہ دور صحابہ ہی میں ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کی تاریخ میں بعض ادوار ایسے ضرور ہوئے جو خلافت راشدہ سے بہت قریب تھے مگر مسلمانوں کی مجموعی تاریخ میں خلافت راشدہ دوبارہ لمبے عرصے کے لئے قائم نہ ہو سکی۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلمان بادشاہ خود کو خلیفہ قرار دیتے رہے اور اپنی ذات اور خاندان کو چھوڑ کر باقی لوگوں پر اسلام کا نفاذ کرتے رہے۔ یہی معاملہ بعد کی بادشاہتوں میں جاری رہا۔

عثمانی بادشاہت بھی دیگر بادشاہتوں کی طرح ایک شاہی نظام تھا جو اپنے آخری سانس لے رہا تھا۔ اتحادی افواج نے جب ترکی کے مقبوضات کو فتح کیا اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تو ترکی کے پاس بس یہی جزیرہ نما اناطولیہ باقی رہ گیا۔ اس علاقے میں انہوں نے بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ اس دور میں دنیا میں اور بھی بہت سی بادشاہتیں ختم ہوئی تھیں۔ یہ اہل ترکی کا اپنا معاملہ ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ اس معاملے میں ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ترکی کی خلافت بس نام ہی کی خلافت تھی۔

خواتین سے متعلق تبدیلیاں

دین اسلام خواتین کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔ قرآن مجید میں سورہ بقرہ، نساء، نور، احزاب اور طلاق کا مطالعہ کرتے چلے جائیے۔ اس میں ہمیں جگہ جگہ خواتین کے حقوق کا تحفظ ہی ملے گا۔ یہی معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحیح احادیث کا ہے۔

قرون وسطی کے مسلم معاشروں میں غیر مسلم دنیا کی طرح جاگیرداری نظام کو رائج کیا گیا۔

اس نظام میں خواتین کے بہت سے حقوق سلب کر لیے گئے۔ انہیں مردوں کے مقابلے میں کمتر بنا دیا گیا۔ زندگی کے معاملات میں ان کا رول ختم کر دیا گیا۔ اس صورت کا اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مصطفیٰ کمال نے ترکی میں خواتین کو ووٹ اور ملازمت کے حقوق دیے جو کہ ایک مستحسن اقدام تھا۔

خواتین کو حقوق دینے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک ہٹلر کی طرز کے فاشسٹ ڈکٹیٹر کا طرز عمل اختیار کیا۔ انہوں نے حجاب پر پابندی عائد کر دی۔ خواتین کو مجبور کیا جانے لگا کہ اگر وہ ملازمت یا تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیں تو وہ ایسا مغربی لباس پہنیں جس میں عریانی کا عنصر نمایاں ہو۔ کمال ازم کے حامیوں نے بدکاری کو جائز قرار دے دیا۔ انہوں نے برہنہ ساحلوں کو فروغ دیا اور نائٹ کلبوں میں برہنہ رقص، اسٹرپ ٹیز اور عصمت فروشی کو پروان چڑھایا۔ ان کے ہاں اگر ایک خاتون کم لباسی کا مظاہرہ کرنا چاہے تو قانون اسے نہیں روک سکتا البتہ اگر کوئی خاتون اپنے جسم کو ڈھانپ کر رکھنا چاہے تو سیکولرازم کے علم بردار ہمارے مولویوں کی طرح ''سیکولرازم خطرے میں ہے'' کا نعرہ لگا کر میدان میں کود پڑتے ہیں۔

ان اقدامات کے نتیجے میں ان حضرات نے خواتین کی ایک بہت بڑی تعداد کو تو مغربی لباس پہننے پر مجبور کر دیا ہے مگر وہ ان کے دلوں سے حیا کو اس حد تک نہیں نکال سکے کہ وہ مکمل مغربی ہو جائیں۔ ترکی میں خاندانی نظام اب بھی بہت مضبوط ہے۔ ظاہر ہے کہ مصطفیٰ کمال کے ان اقدامات کی جتنی بھی مذمت کی جائے، کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فاشزم اور انتہا پسندی خواہ مذہب کے نام پر کی جائے یا سیکولرازم کے نام پر، یکساں طور پر قابل مذمت ہے۔

اس معاملے میں سیکولر حضرات کے ہاں ایک عجیب قسم کی منافقت پائی جاتی ہے۔ اگر کوئی نام نہاد مذہبی گروہ مذہب کے نام پر لوگوں پر جبر و تشدد کرتا ہے تو یہ لوگ لنگوٹ کس کر میدان میں آ

جاتے ہیں اور انسانی آزادی کی دہائی دیتے ہیں۔ مگر دوسری طرف اگر مصطفیٰ کمال ایک فاشسٹ حکمران کا کردار ادا کرتے ہوئے حجاب پر پابندی عائد کرتے ہیں تو یہ لوگ انہیں ہیرو قرار دیتے ہیں۔ اس وقت انسان کی شخصی آزادی کے سارے اسباق انہیں بھول جاتے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں بھی مذہبی لوگوں کی طرح دوہرے معیارات موجود ہیں۔ جہاں اپنا فائدہ ہو، وہاں دونوں انسانیت اور مذہب کا درس دیتے نظر آتے ہیں اور جب اپنے مفاد پر ضرب پڑتی ہو تو پھر دوسرا معیار اختیار کر لیا جاتا ہے۔

اس کے برعکس فاشسٹ مذہبی گروہوں کے خلاف خود دین دار طبقے میں ایک مضبوط آواز موجود ہے۔ اگر کوئی مذہبی گروہ اپنا نقطہ نظر لوگوں پر مسلط کرتا ہے تو دین دار طبقے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اس کی بھرپور مخالفت کرتے ہیں۔ وہ فاشسٹ مذہبی گروہوں کی غلطی واضح کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کسی پر اپنا نقطہ نظر مسلط کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کے برعکس سیکولر حضرات نے شاید ہی کبھی اپنے فاشسٹوں کی مخالفت کی ہو۔

ایک غیر جانبدار شخص یہ مشاہدہ کر سکتا ہے کہ اس معاملے میں اہل مذہب، سیکولر حضرات کے مقابلے اخلاقی اعتبار سے بہت بلند مقام پر کھڑے ہوئے ہیں۔

[جاری ہے]

جس طرح دنیا میں تجارت بداخلاقی کے ساتھ نہیں کی جاسکتی
اسی طرح جنت کی تجارت بداخلاقی کے ساتھ نہیں کی جاسکتی (ابو یحییٰ)

پروین سلطانہ حنا

غزل

ہم بھی فارغ تم بھی فارغ آؤ کریں کچھ باتیں بھی
دل میں آگ لگا دیتی ہیں ساون کی برساتیں بھی

لوگ ہمارے، بچھڑے سارے یاد ہمیں جب آتے ہیں
رمِ جھم رم جھم برساتی ہیں بھیگی بھیگی راتیں بھی

پار افق کے جس بستی میں لوگ ہمارے رہتے ہیں
کیا ان کو بھی یاد آتی ہیں اکثر وہ ملاقاتیں بھی

جگنو، چاندنی اور ستارے، بچپن کے وہ خواب ہمارے
خوشبو بن کر چھا جاتی ہیں بھولی بسری باتیں بھی

ایک دور تھا جب یہ باتیں غیر مہذب لگتی تھیں
رائج ہیں اب کلچر بن کر وہ ساری خرافاتیں بھی

تم آپس میں جھگڑا کر کے اپنا آپ گنوا مت دینا
دیکھو تاک میں بیٹھی ہیں نا دشمن کی وہ گھاتیں بھی

دائیں ہاتھ سے ایسے دینا، بائیں ہاتھ کو خبر نہ پہنچے
ورنہ دل کا خون کریں گی اپنوں کی خیراتیں بھی

دین کی جو خدمت کرتے ہیں، ان کی خدمت عین عبادت
خود داری میں کہہ نہیں پاتے کرتے ہیں ملاقاتیں بھی

نیکی اور شرافت ہی تو سب سے اچھی قدریں ہیں
کون انھیں یہ سمجھائے جو پوچھ رہے ہیں ذاتیں بھی

تم سے مل کر میرے دل کو ایک سکون سا ملتا ہے
رنگِ حنا میں دل کش باتیں اچھی ہیں سوغاتیں بھی

آسمان وزمین کی وسعت والی جنت کن کے لیے ہے

’’اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو۔
اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے مہیّا کی گئی ہے۔
اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔
دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمھارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں کے برابر ہے۔ یہ پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے۔
ان کے لیے جو ہر حال میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال۔
جو غصے کو پی جاتے ہیں۔
اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں...... ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں......
اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں...... کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو۔
اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔
ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انھیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لیے۔‘‘

(آل عمران 3:136-130)